تنزیل و تاویل

امثال القرآن

(۳)

از جناب مولوی محمد ایوب صاحب جیراجپوری

آیات زیر بحث کا دوسرا ٹکڑا یہ ہے :

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

اور اللہ دو آدمیوں کی مثال بیان کرتا ہے ان میں سے ایک گونگا ہے، کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا، اپنے مالک پر ایک بار ہے، اسے جہاں کہیں بھی بھیجتا ہے کوئی فائدہ حاصل کر کے نہیں لوٹتا، کیا ایسا شخص اس شخص کے برابر ہے جو عدل و قسط کا حکم دیتا ہے اور سیدھے راستے پر ہے۔

اس آیت میں اللہ اور غیر اللہ یعنی معبود حقیقی اور معبودان باطل کی مثال بیان کی گئی ہے۔ معبودانِ باطل کی مثال تو اس گونگے آدمی کی سی ہے جو قوت عقل اور گویائی دونوں سے یکسر محروم ہو، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جو دل اور زبان دونوں کا گونگا ہو، اور پھر اس کے عجز و ناتوانی کا حال یہ ہو کہ کوئی کام بھی کرنے کی قدرت اس میں نہ ہو، خواجگی و آقائی کرنا تو درکنار خدمت بندگی اور غلامی کرنے میں بھی اتنا گھٹیا ہو کہ اس کا آقا اس سے کوئی بھلا کام نہ لے سکے۔ ان کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کی مثال اس شخص کی سی ہے جو حکمراں اور کارفرما ہو۔

معبودان باطل بے حیات ہیں ۔ عاجز و درماندہ ہیں ۔ بندگی میں بھی گھٹیا درجہ پر ہیں ۔ بخلاف اس کے اللہ نہ صرف ذی حیات ہے بلکہ منبعِ حیات ہے ، عاجز نہیں بلکہ توانا و قادر مطلق ہے ، گونگا نہیں بلکہ متکلم ہے ، عدل کا حکم دیتا ہے اور خود بھی راہِ عدل (صراطِ مستقیم) پر ہے ۔ اور یہ اوصاف اس کے اندر پورے کمال اور پوری شانِ محبوبیت کے ساتھ موجود ہیں ۔ اس کا عدل یعنی حق کے مطابق حکم دینا خود اس امر کا مقتضی ہے کہ وہ حق اور عدل کی حقیقت بدرجۂ اتم اپنے اندر رکھتا ہے اور اسی کی اپنے بندوں کو تلقین کرتا ہے ۔ اس کو پسند کرتا ہے اور اسی کے مطابق عمل کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے ۔ اُس کے مرکز سے ہٹ کر کبھی کسی بات کا حکم نہیں دیتا بلکہ اس کے مخالف اوصاف یعنی ظلم و جور اور سفاہت و بطالت وغیرہ نقائص سے بالکل پاک منزہ ہے ، اور جو حکم بھی دیتا ہے وہ سراپا عدل ہی ہوتا ہے ۔ اس کا امر بالعدل (عدل کا حکم دینا) دونوں طرح کے امر کو شامل ہے ، یعنی امرِ تشریعی اور امرِ تکوینی ۔ یہ دونوں کے دونوں عدلِ محض کا پرتو ہیں جن میں جور کا شائبہ تک نہیں ۔ چنانچہ آنحضور صلعم خدا سے مخاطب ہو کر فرمایا کرتے تھے :

اللّٰهم انی عبدك ابن عبدك ابن امتك ناصيتي بيدك ماضٍ فِيَّ حكمك عدل فِيَّ قضاءك	خدایا ! میں تیرا بندہ ہوں ، تیرے بندے کا بیٹا ، تیری کنیز کا بچہ ۔ میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے ۔ میرے حق میں تیرا حکم نافذ ہے ۔ میرے معاملہ میں تیرا فیصلہ بہر حال حق بجانب ہے ۔

یہاں "قضاء" سے مراد وہی امرِ تکوینی ہے ، کیونکہ اس کے "امر" کی یہ شان ہے کہ جب کسی چیز کی تخلیق کا ارادہ کرتا ہے تو صرف اتنا فرماتا ہے کہ "ہو جا" اور بس وہ ہو جاتی ہے ۔

فَاِنَّمَا اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ۔

لہذا اس کا حکم اور اس حکم سے متعلق قضاء و قدر سب عین حق اور عدل ہیں ۔

امر بالعدل کی صفت بیان کرنے کے بعد اپنی دوسری صفت اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کی ہے کہ

وہ "سیدھی راہ پر ہے" (اِنَّہٗ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ) حضرت شعیبؑ کا یہ قول بھی اسی حقیقت کا حامل ہے:

اِنِّیْ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ رَبِّیْ وَرَبِّکُمْ مَا مِنْ دَآبَّۃٍ اِلَّا ھُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِھَا اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ

میں نے اللہ پر بھروسا کیا ہے جو میرا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے۔ ہر چلنے والے جاندار کی پیشانی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ بیشک میرا پروردگار سیدھی راہ پر ہے۔

حضرت شعیبؑ کے الفاظ "مَا مِنْ دَآبَّۃٍ اِلَّا ھُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِھَا" اور آنحضور صلعم کے الفاظ "ناصیتی بیدك" دونوں میں ایک ہی روح ہے۔ اسی طرح "اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ" اور "عدل فی قضاؤك" بھی ایک ہی حقیقت کی دو مختلف تعبیریں ہیں۔ پہلی صفت کو "ملک" اور دوسری کو "حمد" کہتے ہیں، وھو سبحانہٗ لہ الملك ولہ الحمد

"خدا سیدھے راستہ پر ہے" اس جملہ کی گہرائیوں میں اترو اور دیکھو کہ اس کی تہ میں جمالِ الٰہی کے کتنے انوار پوشیدہ ہیں۔ سیدھے راستہ پر ہونے کا اقتضاء یہ ہے کہ وہ جو کچھ کرتا ہے، حق فرماتا ہے۔ جب حکم دیتا ہے عدل ہی کا حکم دیتا ہے۔ جو کچھ کرتا ہے مصلحت، حکمت، رحمت اور عدل کے حدود سے باہر ہو کر نہیں کرتا۔ مختصر یہ کہ قول اور فعل دونوں لحاظ سے حق پر ہے۔ پس ناممکن ہے کہ اپنے کسی بندے پر یک سر موظلم کا فیصلہ کرے، یا بغیر کسی گناہ کے اسے سزا دے، یا اس کی نیکیوں میں سے زبردستی کچھ کم کر دے، یا دوسرے کے گناہ کا بوجھ خواہ مخواہ اس پر ڈال دے جنہیں نہ تو اس نے براہ راست خود کیا ہو نہ ان کے لیے کسی حیثیت سے ذریعہ بنا ہو۔ غرضیکہ وہ کبھی کوئی ایسا کام نہیں کرتا جو اس کے لیے حمد و ثنا کا باعث نہ ہو اور اچھے اور مفید انجام اور حکیمانہ مقاصد پر مشتمل نہ ہو۔ کیونکہ اس کا صراطِ مستقیم پر ہونا ان تمام باتوں کی نفی کرتا ہے۔

محمد ابن جریر طبری اس جملہ کی تفسیر یوں فرماتے ہیں :

"ہمارا پروردگار طریق حق پر ہے اپنے نیک اور محسن بندے کو اس کی نیکی اور احسان کا بدلہ دیتا ہے اور برے کو اس کی برائی کا۔ کسی پر کوئی ظلم نہیں کرتا اور نہ کسی سے اسلام و ایمان کے ماسوا کسی شئے کو قبول کرتا ہے"

اس کے بعد امام مجاہد کا قول نقل کرتے ہیں کہ صراط مستقیم سے مراد صراط حق ہے۔

ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ جملہ آیت "اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ" بیشک تیرا رب گھاتیں لگائے ہوئے کا ہم معنی ہے۔ مگر یہ اختلاف محض لفظی ہے۔ ورنہ اس جماعت کے خیال کا ماحصل بھی وہی ہے جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ کیونکہ خدا کے گھات میں رہنے کا مطلب بھی تو یہی ہے کہ وہ برے کو برا اور اچھے کو اچھا بدلہ دے گا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس جملہ میں حذف ہے اور اس کی تقدیر یوں ہے "اِنَّ رَبِّیْ یحثکم علی صراط مستقیم و یحضکم علیہ" یعنی میرا پروردگار تمہیں صراط مستقیم پر چلنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اگر ان لوگوں کی اس حذف و تقدیر سے مراد یہ ہے کہ آیت کا مقصود بالذات مفہوم یہی ہے تو وہ غلطی پر ہیں۔ اس مقدر پر ان کے پاس کوئی دلیل نہیں جسے وہ پیش کر سکیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے الگ الگ دو صفتیں بیان کی ہیں، ایک امر بالعدل کی، دوسری صراط مستقیم پر ہونے کی۔ امر بالعدل کے مفہوم و معنی ہیں وہ بات تو آ ہی گئی جسے یہ لوگ "اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ" کے متعلق فرماتے ہیں۔ پھر دوسرے ٹکڑے کے کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہاں اگر ان کا مقصد اس مقدر کے ماننے سے یہ ہے کہ خدا کا صراط مستقیم پر بذات خود ہونا اس امر کو مستلزم ہے کہ وہ اپنے بندوں کو بھی اس کے لیے ترغیب دیتا ہے تو ان کا خیال صحیح ہے۔

ایک جماعت اس جملہ کی تفسیر یہ کرتی ہے کہ وہ تمام امور اور ساری مخلوق کو خدا ہی کے پاس لوٹ کر جانا

ہے، کوئی شے اس سے بچ کر نہیں نکل سکتی" سو یہاں بھی ہم وہی بات کہنا چاہتے ہیں کہ اگر یہ جماعت اپنے اس قول کو آیت کا منصوص معنی سمجھتی ہے تو بر سر غلط ہے، ہاں اگر اسے اس آیت کے لوازم اور موجبات میں سے شمار کرے تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔

تفسیروں میں اس آیت کی ایک اور تاویل دیکھنے میں آتی ہے۔ وہ یہ کہ "ہر چیز خدا کے قبضۂ قدرت اور ملک میں ہے" بجائے خود یہ بات خواہ کتنی ہی حق سہی لیکن جس آیت کی تفسیر میں وہ پیش کی جاتی ہے اس کا مفہوم ہر گز یہ نہیں۔ اس بات کے کہنے والوں نے شاید غور نہیں کیا کہ حضرت شعیبؑ نے اپنے قول میں دو جملے فرمائے ہیں۔ پہلے تو انھوں نے "مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا" فرمایا ہے۔ پھر اس کے بعد "اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ" یہ دونوں جملے الگ الگ ہیں اور دونوں اپنے اپنے مستقل معانی رکھتے ہیں۔ ان میں سے پہلا جملہ خدا کی قدرت کی ہمہ گیری ظاہر کر چکا تھا۔ پھر اس جملہ میں اسی بات کو دہرانے کی کیا ضرورت تھی؟

الغرض امام مجاہدؒ کا قول صحیح ہے اور یہی اکثر ائمۂ تفسیر کا خیال ہے۔ ادبی لحاظ سے اس کا دوسرا مطلب ٹھیرانا بہت مشکل ہے۔ اور اگر غور کرو تو معنوی اعتبار سے بھی یہ خیال نہایت بلند اور پاکیزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "وہ جسے چاہتا ہے (یعنی جس کے بارے میں اس کی حکمت مقتضی ہوتی ہے) گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم پر لے آتا ہے"۔ پس اگر خدا ہی وہ ذات ہے جس نے انبیاء اور ان کے اتباع کو قولاً و عملاً صراطِ مستقیم پر قائم کیا ہے تو وہ اس امر کا اور زیادہ مستحق ہے کہ اپنے قول اور فعل کے اعتبار سے صراطِ مستقیم پر ہو۔ اور اگر ہدایت یاب انسانوں کی صراطِ مستقیم اپنے رب کے احکام کی موافقت کا نام ہے تو خدا کی صراطِ مستقیم نام ہوگا اس کے اس قولِ حق یا فعلِ حق کا جو اس کی شانِ حمد اور شانِ کمال کا مقتضا ہے۔

اب اصل تمثیل کے مضمون کی طرف آیئے۔ اس تمثیل میں بھی پہلی مثال کی طرح ایک دوسرا قول ارباب تفاسیر نے نقل کیا ہے جس کا مدعا یہ ہے کہ یہ مثال کافر اور مومن کی ہے۔ لیکن چونکہ پہلی تمثیل پر بحث کرتے

ہوئے ہم نے اس خیال کی توجیہہ کردی ہے اس لیے دوبارہ اس سے تعرض کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۱۰) کلام باری تعالیٰ سے اور اس میں تدبر کرنے سے اعراض کرنے والوں کی مثال:

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ۝ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ ۝ فَرَّتْ مِن قَسْوَرَةٍ ۝

ان لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ اس نصیحت (یعنی قرآن) سے یوں بدکتے ہیں جیسے جنگلی گدھے شیر سے ڈر کر بھاگتے ہیں۔

یہ ایک نہایت عمدہ اور بلیغ تشبیہ ہے۔ قرآن سے بھاگتے ہی وہ لوگ ہیں جو اسکی حقیقت سے بالکل نابلد ہوتے ہیں۔ ان کی ہیئت یعنی ان جنگلی گدھوں کی کیفیت باطنی سے بالکل مشابہ ہوتی ہے جو کسی بات کی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے اور جب کسی چیز کی آہٹ پاتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ شیر ہی ہوگا، لہذا سر پہ پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ قرآن سے بھاگنے والے بھی اپنی حماقت سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی پھاڑ کھانے والی چیز ہے حالانکہ یہ سرچشمۂ خیر و سعادت اور منبع حیات ہے۔ پھر راز زندگی کو پیام موت سمجھنے والا گدھا نہ ہوا تو اور کیا ہوا؟

"مستنفرۃ" کے لفظ میں جو بلاغت ہے وہ "نافرۃ" کے لفظ سے ہرگز نہ پیدا ہوسکتی۔ نافرہ کے معنی صرف بھاگنے والے کے ہیں۔ لیکن مستنفرہ کے لفظ میں بھاگنے اور دوسرے بھاگنے، دونوں کا مفہوم شامل ہے جو یہ ظاہر کر رہا ہے کہ فرار کی شدت اتنی بے پناہ تھی کہ گویا ایک کا فرار دوسرے کیلیے بھاگنے کا باعث ہوا اور ایک نے دوسرے کو بھاگنے پر ابھارا۔ یہ لطف "نافرہ" کہنے میں پیدا نہ ہوسکتا تھا۔

ایک قرأت "مُستنفَرۃ" کی بھی ہے یعنی فَ کو مفتوح پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں یہ لفظ اسم فاعل ہونے کے بجائے اسم مفعول ہوگا اور معنی یہ ہونگے کہ شیر کے خوف نے ان گدھوں کو بھاگنے پر برانگیختہ کیا۔

(۱۱) غیبت کی مثال:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ

(الحجرات - ۲)

اے ایمان والو بہت قیاس آرائیاں کرنے سے پرہیز کرو کیونکہ گمان و قیاس گناہ بھی ہو جاتے ہیں لوگوں کے حال کا تجسس نہ کیا کرو۔ اور ایک دوسرے کی غیبت بھی نہ کیا کرو۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے اور لوگ اس سے گھن کھانے لگیں؟ اللہ سے ڈرو بیشک وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

کسی مسلمان کے پردۂ ناموس کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی تشبیہ اس کے گوشت کو پارہ پارہ کردینے سے دینا قیاس تمثیلی کی کیسی بے نظیر مثال ہے۔ چونکہ غیبت کرنے والا اپنے مسلمان بھائی کی عزت پر اس وقت حملہ کرتا ہے جب وہ آنکھوں کے سامنے نہیں ہوتا اس لیے اس کا حال بالکل اس شخص کا ہے جو کسی کی روح غائب ہو جانے (یعنی مرجانے) کے بعد اس کے جسم سے گوشت نوچتا ہو۔ اور چونکہ وہ غریب اپنی اس غیبت سے بالکل بے خبر ہوتا ہے اور اپنی مدافعت بھی نہیں کرسکتا اس لیے وہ بمنزلہ اس بے جان لاش کے ہے جسکی بوٹیاں کاٹی جارہی ہوں اور وہ اپنے کو بچانے کی قدرت نہ رکھتی ہو۔ نیز چونکہ غیبت کنندہ دوسرے کی متاع عزت سے متمتع ہوتا ہے اور اس کی مذمت سے اپنے نفس کی پیاس بجھاتا ہے اس لیے اس کی تشبیہ گوشت کھانے والے کے ساتھ دی جو مردہ بھائی کی بوٹیاں چبا کر اپنے پیٹ کی آگ بجھاتا ہو۔ اور اس لحاظ سے کہ وہ اس بدگوئی کو پسند بھی کرتا ہے اس کی تشبیہ اس شخص کے ساتھ دی گئی جو اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند بھی کرتا ہو۔ اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ کے الفاظ اس جرم کو اور زیادہ سخت بنا دیتے ہیں۔ کراہت کے ساتھ مردے کا گوشت کھانے سے بدتر درجہ یہ ہے کہ رغبت کے ساتھ کھایا

جائے۔ اور ظاہر ہے کہ غیبت کرنے والا آدمی اس غیبت سے لذت بھی لیتا ہے۔

گہری نظر سے اس تشبیہ کے موقع ومحل اور اس کے محاسن پر غور کرو، معقول (مشبہ) اور محسوس (مشبہ بہ) میں کیسا کامل تطابق ہے۔ پھر یہ بھی دیکھو کہ اندازِ بیان کیسا بلیغ اور موثر ہے۔ بھائی کا گوشت نوچ نوچ کر کھانا طبعاً ہر شخص کو گھناؤنا معلوم ہوتا ہے۔ اور تمام مخاطبین کے اندر اس فطری احساس کراہیت کا موجود ہونا یقینی ہے۔ لہٰذا پہلے تو خدا نے اس احساس کے وجود کی خود خبر دی پھر آیت کے آخر میں تمام مخاطبین کو اس وصف سے متصف قرار دیا (فَكَرِهْتُمُوهُ) نیز اس سے قبل آیت کے شروع میں استفہام انکاری کے ذریعہ اس حقیقت کی مزید توثیق کر دی (أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ) اس طرح ایجابی اور سلبی دونوں پہلوؤں سے اس فطری احساس کو دماغ میں مستحضر کرنے کے بعد ان پر اس امر کو واضح کیا کہ جب یہ شئے تمہاری طبیعت کو گھناؤنی معلوم ہوتی ہے تو پھر کس طرح وہ شئے تمہیں مرغوب خاطر ہو سکتی ہے جو اسی کے مشابہ ہے؟ گویا اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ایک ناپسندیدہ شئے سے اُس شئے کے خلاف حجت قائم کی جو انھیں مرغوب ہے۔ پھر شئے مرغوب کو اس شئے نامرغوب کے ساتھ تشبیہ دی جس سے انھیں کامل نفرت اور نہ کم ہونے والی کراہیت ہے۔ پس عقل، فطرت اور حکمت عام کا تقاضا ہے کہ وہ اس شئے سے بھی ویسی ہی نفرت اور کراہیت رکھیں جیسی اُس کی نظیر اور مماثل سے رکھتے ہیں۔

(۱۲) اعمال کفار کی بے حقیقتی کی تشبیہ:

مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلَىٰ شَيْءٍ ذَٰلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ (ابراہیم - ۳)

جن لوگوں نے اپنے پروردگار کے ساتھ کفر کیا اُن کے اعمال کی مثال اس راکھ کی سی ہے جسے لُو کے دن تیز ہوا اُڑا لے جائے۔ وہ اپنے کیے ہوئے اعمال میں سے کسی عمل (کا ثواب حاصل کرنے) پر قادر نہ ہوں گے۔ یہ ہے پرلے درجہ کی ناکامی۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے کفار کے باطل اور غیر نافع اعمال کو ایسی راکھ سے تشبیہ دی ہے جس پر تیز و تند ہوا کا گزر ہو۔ یعنی چونکہ ان اعمال کی نہ تو ایمان کی بنیاد پر تعمیر ہوئی تھی، نہ خدا کے لیے وہ کیے گئے تھے اور نہ ہی خدا کے حکم کے مطابق تھے، اس لیے خدا کے حضور میں بالکل ہی بے وزن اور بے حقیقت ٹھیریں گے، اتنے بے وزن کہ خدا نے ان کو اس راکھ کے مشابہ قرار دیا جسے باد صرصر ادھر سے اُدھر اُڑاے جائے اور کوئی شخص اسے کام میں لانے پر قادر نہ ہو درانحالیکہ وہ اس کا شدید حاجت مند بھی ہو۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ "لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلٰى شَيْءٍ"، یعنی جن اعمال سے وہ فلاح کی اتنی امیدیں باندھے بیٹھے ہیں قیامت کے دن ان سے اپنی امیدیں اور ضرورتیں پوری کرنے پر مطلق قادر نہ ہونگے اور وہ اعمال ان کے لیے کسی فائدہ اور ثواب کے موجب ہرگز نہ بنیں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو صرف انہیں اعمال کو شرف قبول بخشے گا جو اسی کے لیے اور اسی کی نازل کی ہوئی شرع کے موافق ہوں۔ اور ان لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ ان کے کبسہ اعمال میں خلوص اور اطاعت الٰہی کا ایک حبہ بھی نہ ہوگا۔

راکھ کے ساتھ ایسے غیر مقبول اعمال کی تشبیہ دینے میں ایک نہایت لطیف نکتہ مضمر ہے۔ راکھ کے مادّہ کو کون سی چیز زائل کر کے راکھ بناتی ہے؟ آگ۔ اور ان اعمال کو کون سی چیز بے اصل اور بے وزن بنائے گی؟ وہ بھی آگ ہی ہوگی۔ کیونکہ جو اعمال ایمان باللہ اور اطاعت الٰہی کی روح سے خالی ہوں گے وہ دوزخ کی آگ کی خوراک بنیں گے۔ مالک یوم الدین ان باطل اعمال ہی سے ان کے لیے آگ اور عذاب پیدا کریگا، جس طرح کہ وہ اپنے مخلص پرستاروں اور فرمانبرداروں کے اعمال ہی سے ان کے لیے لذت اور نعمت پیدا کریگا۔ پھر آگ ان اعمال کو جلا کر خاکستر بنا دے گی اور انجام کار یہ منکرین حق ان کے اعمال اور ان کے سارے معبود آگ کے ایندھن ہو جائینگے۔

(باقی)